مطالعۂ کائنات کا قرآنی نظامِ حکمت

ملک محمد فیروز فاروقی

عصرِ حاضر میں دینِ اسلام کے خلاف لادینی افکار و نظریات کا جو سیلاب اٹھا چلا آرہا ہے اس کا مرکز و محور مغرب کا وہ نظامِ حکمت ہے جو وہاں کے فضلاء نے انسانی مسائل کو حل کرنے کی غرض سے تشکیل دیا ہے۔ اس نظامِ حکمت کا سب سے بڑا ستون بے خدا سائنسی فکر اور حیات بعدالموت کے انکار کا تصور ہے۔ گزشتہ دو صدیوں سے افکارِ مغرب کو جن خطوط پر آگے بڑھایا جارہا ہے انھوں نے ایسے خدشات کو جنم دیا ہے جو خود تہذیبِ جدید کے مستقبل کے لئے ایک زبردست چیلنج بن گئے ہیں اور اس نظامِ حکمت کے خالقین ایک مسلسل اضطراب میں مبتلا ہیں۔ ان حالات میں ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم قرآنی نظامِ حکمت کو پورے علمی زور اور قوتِ استدلال کے ساتھ، مثبت انداز میں پیش کریں اور غیر قرآنی نظامہائے حکمت کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے اس کی خامیوں اور ناکامیوں کو آشکار کریں۔ افکارِ مغرب کی یلغار کے مقابلے میں چُپ سادھ لینے کی روش ہمارے ملّی تقاضوں کے لئے بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم نظریات اور نصب العینوں کی موجودہ سرد عالمی جنگ میں دفاعی یا فراری انداز کو ترک کر کے جارحانہ طریق اپنائیں اور قرآنی نظامِ حکمت، اس کی خصوصیات، مشتملات اور متعلقات کو مرتب کریں۔

قرآنی نظامِ حکمت پر گفتگو کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ حکمت کے مفہوم اور نفسِ موضوع کو واضح کر دیا جائے۔ مطالعۂ کائنات کے نظامِ حکمت (PHILOSOPHICAL SYSTEM) سے مراد کائنات اور کائناتی حقائق کی ایک ایسی منظم و مربوط تشریح ہے جو انسانی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے کی جائے۔ یہ تشریح کائنات کے تمام شعبوں پر محیط ہو اور اپنے فلسفیانہ اور طبیعی مزاج کے

لحاظ سے کائناتی تخلیق کے تقاضوں اور مقاصد سے ہم آہنگ ہو۔

قرآنی نظامِ حکمت کا مرکز و محور وہ نظریۂ کائنات ہے جسے قرآن کریم نے نہایت تفصیل کے ساتھ جابجا بیان کیا ہے۔ کائناتی حقائق کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی تشریح اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کائنات کے بارے میں ایک نظریہ قائم نہ کیا جائے۔ اس نظریہ کے بڑے بڑے مباحث یہ ہیں:

۱۔ کائنات کی تخلیق ایک حادثہ ہے یا منصوبہ؟

۲۔ کائنات کے مشتملات کیا ہیں اور انسان کو ان میں کیا مقام حاصل ہے؟

۳۔ کائنات کی تخلیق اور انسانی زندگی کا کوئی نصب العین متعیّن ہے یا نہیں؟

مفکّرینِ مغرب نے سائنس و مذہب کی تفریق کے نظریہ کی روشنی میں ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اور ان جوابات نے جس نظریۂ کائنات کو جنم دیا ہے اس کا مرکز و محور یہ تصوّر ہے کہ کائنات از خود وجود میں آگئی ہے۔ خود مختار تخلیق کے اس نظریہ کی جدید ترین تشریح چارلس رابرٹ ڈاروِن نے کی ہے جس کے مطابق کائنات اور اس کے تمام تر مشتملات ایک بے بصر (BLIND) عملِ ارتقاء کے ذریعے معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ ڈاروِن (۱۸۰۹ء تا ۱۸۸۲ء) کے ان نظریاتِ ارتقاء کو افکارِ مغرب میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جولیاں ہکسلے (JULIAN HUXLEY) کو نئے علمی انکشافات کی وجہ سے ڈارونیت سے کافی حد تک انحراف کرنا پڑا ہے لیکن اس کے باوجود ڈارونیت کے نظریات کا فکرِ مغرب پر بہت زیادہ غلبہ موجود ہے۔ انیسویں صدی کی مادیت پرستانہ فکری کاوشوں کے اس نتیجہ نے بہت سے فلسفیانہ نظریات کو متاثر کیا ہے۔ ڈارونیت نے اپنے فلسفیانہ استدلال کے ذریعے ایک مرتبہ پھر بے خدا سائنسی فکر اور اس کی منہاجیات کو سہارا دینے اور مہمیز لگانے کی بھرپور کوشش کی ہے کیونکہ ڈارون اور اس کے ہمنواؤں کے تمام تر نظریات کا خلاصہ یہی ہے کہ کائنات کی تخلیق ایک حادثہ ہے اور اس کی منصوبہ بندی اور طبعی قوانین کی کارفرمائی، ایک حادثاتی اور خود مختار تخلیقی عمل کے بعد از خود وجود میں آگئی ہے۔ جولیاں ہکسلے کی نیو ڈارونیت (NEO - DARWINISM) کے سوا ابھی تک کائناتی تخلیق کے مادی نظریات میں کوئی تبدیلی یا ترمیم نہیں کی گئی۔ راقم الحروف کے خیال میں مغربی فلسفوں کا یہ نقطۂ عروج ہے۔ اور اس کے بعد کائناتی تخلیق کی خالصتاً مادی تعبیر کی کوئی کوشش نہ

کی جاسکے گی۔ بشرطیکہ ہم قرآنی نظریۂ کائنات اور نظامِ حکمت کو پورے علمی زور اور قوتِ استدلال کے ساتھ پیش کریں اور افکارِ مغرب کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے مدافعانہ انداز کی بجائے جارحانہ طریق اپناکر قرآنی فلسفۂ کائنات کے مضمرات اور حقائق کو آشکار کریں۔

مفکرینِ مغرب کے اس تشکیل کردہ نظریۂ کائنات کے برعکس قرآن پاک نے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ انسان کی اس کے تمام مسائل و مباحث میں مکمل راہنمائی کرتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں جب بغداد، دمشق، قاہرہ، اسکندریہ، حمص، اصفہان، غرناطہ، اشبیلیہ، قرطبہ اور دیگر اسلامی مراکز سے علم و عرفان کے چشمے پھوٹ رہے تھے تو اسی نظریۂ کائنات کو مسلمان علماء و فضلاء نے ساری دنیا میں پھیلایا تھا اور اسی نظریۂ کائنات کی اثر انگیزی تھی کہ مسلمان سائنس دانوں نے سائنسی افکار کی دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کیا اور سائنس کے تجرباتی منہاج تحقیق کی بنیاد رکھی[1]۔ مگر جب مسلمان سیاسی قوت اور اقتدار سے محروم ہوگئے تو علم و عرفان اور سائنسی تحقیقات کے مراکز بھی یورپ میں منتقل ہوگئے۔ وہاں کے مفکرین اور دانشوروں نے مذہب و سائنس کی ثنویت (DUALITY) کے راستہ پر چل کر ایک ایسے نظریۂ کائنات کی تخلیق کی جس کا مقصد کائناتی تخلیق کی سراسر مادی تعبیر کرنا تھا۔ مسلمان اپنے دورِ زوال میں جو اب تک جاری ہے، اس قابل نہ تھے کہ مفکرینِ مغرب کو مذہب و سائنس کی ثنویت کے پُرخطر راستہ سے ہٹا سکتے لہٰذا فکرِ مغرب انہی خطوط پر نشو و نما پاتا رہا۔

قرآن پاک نے جس نظریۂ کائنات کی تعلیم دی ہے اس کی رُو سے کائنات کی تخلیق محض ایک حادثہ نہیں بلکہ ارادہ و مشیت کے تحت سلسلۂ عمل کا نتیجہ ہے۔ طبعی قوانین از خود معرضِ وجود میں آنے کے بعد مصروفِ عمل نہیں ہیں بلکہ ان کی تنظیم و تدبیر ایک علت العلل کے وجود پر ناطق شہادت کی حیثیت رکھتی

---

[1] "ہسٹری آف سائنس" کا برطانوی مؤلف ولیم سیسیل ڈیمپئر (W.CECIL DAMPIER) دیباچہ میں لکھتا ہے کہ تجرباتی طریقِ مطالعہ، یورپ کی تحریک احیائے علوم کی پیداوار ہے۔ مغربی تہذیب کے مآخذ کے بارے میں یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی تاریخ شاہد ہے کہ بغداد اور قرطبہ کی سائنسی تجربہ گاہوں میں مسلمان سائنس دانوں نے یونانی سائنسی فکر کے مزاج تک کو تبدیل کرکے اسے ایک عملی صورت دی تھی۔ مظاہرِ فطرت کے تجرباتی مطالعہ کی دعوت قرآن کریم نے دی تھی۔ اور اسے مسلمان کیلئے ضروری قرار دیا تھا

ہے۔ قرآن پاک نے مذہبی اور فلسفیانہ انداز میں کائناتی تخلیق کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ خالصتاً سائنسی انداز میں اس کی طرف دعوتِ فکر بھی دی ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر انسان کی توجہ مظاہرِ فطرت مثلاً سورج اور چاند کی مستقل وغیر مستقل حرکات، زمین اور زمینی اشکال (LANDFEATURES) کی تقسیم و ترتیب، دن اور رات کا ایک دوسرے میں تبدیل ہونا، زیرِ زمین پانی کی مختلف خصوصیات آسمان اور کرۂ ہوا کے مختلف طبقات، بارش اور بارش برسنے کا جغرافیائی عمل، آبی چکر (HYDROLOGICAL CYCLE) بادل، ہواؤں کی خصوصیات اور ان کی اقسام وغیرہ کی طرف مبذول کرائی ہے[۲]۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان مظاہرِ فطرت اور اشکال میں فطری قوانین کا جو تسلسل، یکسانیت اور ہم آہنگی ہے اس میں غور و فکر کرکے اس سوال کا جواب تلاش کیا جائے کہ ایسا کیوں ہے؟ قرآن کریم کی رُو سے یہ سب کچھ کائنات کے خالق کی حکمت و تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اسی نے ابتداءً کائنات کی تخلیق کی ہے اور وہی تمامتر تخلیقی نتائج پر قادر ہے۔ مفکرینِ مغرب نے اس بات کو ثابت کرنے کی بارہا کوشش کی ہے کہ یہ کائنات اپنے وجود کے لئے کسی خالق کی محتاج نہیں ہے۔ لیکن اس عالمِ مادی کا وجود بہرحال ایک امرِ واقع اور محسوس حقیقت ہے جس سے انکار کسی طور ممکن نہیں۔ اس لئے لامحالہ اس کے موجود ہونے کی توجیہ سے راہ فرار اختیار نہیں کی جاسکتی۔ علمِ طبیعیات کے جدید تصورات کی رُو سے بھی کائنات کی کوئی مادی توجیہ ممکن نہیں رہی۔ لیکن جدید علمِ طبیعیات کے ماہرین کی کور چشمی ملاحظہ کیجئے کہ جیمز جینز (JAMES JEANS) اپنی کتاب "پراسرار کائنات" میں لکھتا ہے کہ "میرے نزدیک کائنات کا سارا معاملہ ہی اب ایک تخیلاتی معاملہ بن گیا ہے"۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید علمِ طبیعیات نے اس معمّا کو حل کرنے کی بجائے خود کائنات ہی کو تخیلاتی معاملہ قرار دے ڈالا ہے۔ جبکہ قرآن کریم نے اپنے مخصوص سائنسی انداز میں تمام تر سوالات کے جواب پیش کئے ہیں۔ جب ہم "آفاق" میں غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ کرۂ زمین ایک گولے کی صورت خلاء میں معلق ہے۔ اور اپنے قطبی محور پر اس طرح گردش کر رہا ہے کہ اس کے باعث دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن آتا ہے۔ پھر یہ کرۂ ارضی سورج کے گرد گھوم بھی رہا

---

[۲] القرآن الکریم، البقرہ: ۱۶۴، آل عمران: ۱۹۰-۱۹۱، الاعراف: ۱۸۵، یونس ۳، ۷، الرّعد: ۲، الانفال: ۸، الرّوم: ۲۰ تا ۲۵، الذّاریات: ۲۱، الملک: ۳-۴

ہے اور سال کی معین مدّت کے اندر اپنا ایک چکر پورا کرتا ہے۔ کرۂ ارضی کی یہ حرکات اس کو صحیح سمت میں قائم رہنے میں مدد دیتی ہیں۔ قطبی محور اور اپنے مدار کی جانب اس کرۂ ارضی کا ۲۳½ درجہ کا جھکاؤ موسموں میں باقاعدگی پیدا کرتا ہے جو زرعی پیداوار کا باعث بنتا ہے۔ مزید برآں فضا میں ایسی گیسیں جو بقائے حیات کے لئے ضروری ہیں، تقریباً پانچ سو میل کی بلندی تک محیط ہیں اور ان کا ایک نہایت دبیز پردہ کرۂ زمین کو شہاب ہائے ثاقب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ گیسوں کا یہ مجموعہ، درجۂ حرارت کو حدِ اعتدال میں رکھتا ہے جو زندگی کی نشوونما اور بقا کے لئے ضروری ہے۔ کرۂ ارضی کے اوپر پانی کے وسیع ذخائر، آبی چکر (HYDROLOGICAL CYCLE) کو جنم دیتے ہیں۔ ان ذخائر سے پانی، آبی بخارات کی صورت میں بادلوں میں چلا جاتا ہے اور بارش برسانے کا موجب بنتا ہے۔ اس سارے عمل میں مختلف خصوصیات رکھنے والی ہوائیں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ "آفاق" کے مطالعہ کے چند ایک پہلوؤں کی طرف اوپر دیئے گئے اشارات ذہن میں سوال پیدا کرتے ہیں کہ یہ ایسا کیونکر ہے؟ کائناتی تخلیق کو محض ایک حادثہ یا اتفاق قرار دینا، خود سائنسی اصولوں کی رُو سے اس قدر لغو ہے کہ اس کا تصوّر کرنا ممکن نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔

عنقریب وہ وقت آئے گا جب ہم لوگوں کو آفاق میں اور خود ان کے اندر (نفسیاتی دنیا میں) ایسے واضح دلائل و نشانات دکھائیں گے کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ حق وہی ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔[۳]

کائنات کے مشتملات اور کائناتی قوانین کے مضمرات میں چونکہ دلائل و نشانات موجود ہیں اس لئے قرآن نے بارہا کہا ہے کہ اپنے اردگرد کے حالات و واقعات میں غور کرو۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس عالمِ وجود کا کوئی صانع نہیں۔ بلکہ طبعی قوانین کی خود مختار کارفرمائی نے اس حادثہ کو برپا کیا ہے اور اس منصوبہ کے پیچھے اور کوئی کارفرما قوت موجود نہیں ہے تو لامحالہ یہ قرار دینا ہوگا کہ یہ کائنات محض ایک حادثہ اور اتفاق (CHANCE) ہے۔ لیکن آگے چلنے سے پہلے ذرا رکیئے اور سوچیئے یہ "اتفاق" کیا چیز ہے؟ کیا یہ کوئی فرضی چیز ہے۔ نہیں یہ ایک بہت ہی زیادہ ترقی یافتہ ریاضیاتی نظریہ ہے۔ جس کا اطلاق

---

[۳] القرآن الکریم۔ حٰمٓ۔ ۵۳

ایسے امور پر ہوتا ہے جن پر قطعی اور یقینی معلومات حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ جن سائنس دانوں نے کائناتی تخلیق کو محض ایک حادثہ یا اتفاق قرار دے کر اس کا تعلق طبعی قوانین کی کارفرمائی سے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کائنات کے عناصر خمسہ (کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک) اور ۹۲ کیمیائی عناصر کی ترتیب وقوع کی ایک قابلِ قبول عقلی توجیہہ پیش کریں لیکن قرآن پاک کا چیلنج ہے کہ ان کے لئے ایسا کرنا ہرگز ہرگز ممکن نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ خلط مبحث کرتے ہوئے راہ فرار تلاش کرتے ہیں۔ خود مغرب کے ماہرین ریاضی نے حساب لگایا ہے کہ کائنات کے ۹۲ کیمیائی عناصر کی بے ترتیبی ایسے اتفاقی واقعہ کا امکان ۱۰^۱۴۰ کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے [۱۲] گویا یہ ایک ایسا بعید از امکان قیاس ہے کہ اعداد کی زبان میں اس کا بیان بھی مشکل ہے۔ ان حالات میں ہمیں لامحالہ قرآن پاک کے پیش کردہ نظریۂ کائنات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کا سائنسی مطالعہ بجائے خود اللہ پر ایمان کا محرک ہے۔ ممتاز ماہر طبعیات لارڈ کیلون (CALVIN) نے درست کہا تھا کہ "آپ جتنا زیادہ غور و فکر سے کام لیں گے، اتنا ہی سائنس آپ کو خدا کے ماننے پر مجبور کرے گا۔"

قرآن حکیم کے اندازِ بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات پر ایمان کے عقیدہ کا تعلق خالص سائنسی اور تجرباتی طریق سے ہے۔ درحقیقت مطالعۂ فطرت کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ یقین کیا جائے کہ اس کی تخلیق ایک ایسی قوت نے کی ہے جو ہمہ جہت (OMNI PRESENT) اور مختارِ کل ہے۔ قرآنی نظریۂ کائنات کی رو سے تخلیقِ کائنات کا نصب العین انسان کی جسمانی اور روحانی حالتِ کمال ہے۔ قرآن پاک کے مطابق کائناتی تخلیق اپنے اندر ایک مقصدیت اور متعین نصب العین رکھتی ہے جس کا براہ راست تعلق قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے۔ قرآنی نظریۂ کائنات میں اس قانون کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے ہر ایک کام کا ایک متعین نتیجہ مقرر کر رکھا ہے۔ نتیجہ خیزی کا یہ قانون اٹل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ قرآن پاک میں واضح الفاظ موجود ہیں:-

---

[۱۲] ۱۰^۱۴۰ کا مطلب یہ ہے کہ ۱۰ کو ۱۴۰ مرتبہ پے در پے ضرب دی جائے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۝

یہی اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے جو ہمیشہ سے جاری ہے اور اس طریقہ میں تم کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے[۵]

قرآنی نظریۂ کائنات پر اوپر مختصر انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ اسی نظریہ کی منظم اور مبسوط تشریح کا نام مطالعۂ کائنات کا قرآنی نظامِ حکمت ہے۔ جس کی اہم خصوصیات یہ ہیں :-

۱۔ وحی کے ذریعے انسانی عقل کی راہنمائی۔ ۲۔ عقیدۂ توحید بحیثیت نقطۂ آغاز۔ ۳۔ متعین مقصد اور نصب العین۔ ۴۔ عمومیت۔ ۵۔ وحدتِ علم اور وحدتِ کائنات۔ ۶۔ تدوین علوم انسانی کا مخصوص انداز۔ ۷۔ انسانی فطرت کے مطالعہ کی اہمیت۔

ذیل میں ان خصوصیات پر مختصر بحث کی جاتی ہے :-

وحی کے ذریعے انسانی عقل کی راہنمائی

قرآنی نظامِ حکمت اور اس سے تمام تر فلسفیانہ مباحث و مسائل کی اہم ترین خصوصیت یہ عقیدہ ہے کہ انسانی عقل کی کامل ترین راہنمائی کے لئے وحی ربّانی کی صورت میں خارجی روشنی کی ضرورت ہے۔ اور اس کے بغیر انسانی عقل اپنا صحیح کردار ادا کرنے سے محروم رہتی ہے۔ قرآنی نظامِ حکمت کی یہ اہم ترین خصوصیت اسے تمام تر غیر قرآنی نظام ہائے حکمت سے ممتاز کر دیتی ہے۔ اس عقیدہ کا مفہوم یہ قطعاً نہیں ہے کہ عقلِ انسانی ایک بیکار شے ہے اور اس کا استعمال بے سود ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقلِ انسانی کی راہنمائی کے لئے وحی کی ہدایت کو لازمی قرار دیا ہے۔ اور وحی کی روشنی کے بغیر اس امر کا امکان ہوتا ہے کہ عقل غلط نتائج مستنبط کر کے غلط فیصلے صادر کرے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر عقل کے استعمال کی تلقین کی گئی ہے۔ عقل کی اس عظمت کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ موجود رہتی ہے کہ تنہا عقلِ انسانی زندگی کے معاملات کو سنوارنے کا کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ تاریخ عالم اور اس کے فلسفہ سے سینکڑوں ہزاروں بلکہ کروڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ تنہا انسانی عقل کے استعمال نے انسانی زندگی کو فوز و فلاح سے ہمکنار کرنے کی بجائے اسے تباہی و بربادی سے دوچار کیا ہے۔ عقل کا دائرۂ کار محسوسات تک محدود ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ حواس کی خبر رساں ایجنسیاں جو معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ عقل ان

[۵] القرآن الکریم، الفتح : ۲۳، یٰسین : ۴۳، بنی اسرائیل : ۷۷، الاحزاب : ۳۸۔

پر تنقید کر کے استدلال کے ذریعے، اپنے متعین حدود کے اندر، صحیح اور غلط کا موازنہ کرتی ہے۔ سائنسی طریق مطالعہ کے ماہرین نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ تنہا عقل کا استعمال کافی نہیں ہے[1]

قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق عقلِ انسانی کا کردار ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ عقل، انسانی زندگی کے نصب العین کے حصول میں امداد و اعانت کرے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حیوان پر انسان کی فضیلت کا سبب عقل کا وجود نہیں بلکہ نصب العین کے حصول کا جذبہ ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقل کی اہمیت ذاتی اور اصلی نہیں ہے بلکہ ضمنی اور ثانوی ہے۔ عقل، اگر انسانی زندگی کے مقصد کے حصول میں مدد نہ کرے تو بے کار محض ہے اور انسان کو حیوانیت کے درجہ سے بھی نیچے گرا دیتی ہے۔ چونکہ انسان کے دوائر حیات ایک طبعی پہلو کے ساتھ ساتھ ایک غیر طبعی پہلو بھی رکھتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے کچھ ایسے مسائل ہوں جن کو حل کر کے وہ زندگی کے غیر طبعی پہلو کے تقاضوں کی تسکین کر سکے۔ عقل، حسّی علم اور مشاہدات کے بل بوتے پر ہماری زندگی کے طبعی پہلو کے مسائل تو حل کر سکتی ہے لیکن انسانی تاریخ گواہ ہے کہ زندگی کے غیر طبعی پہلو کے مسائل کو صرف عقل اور حسّی علم کے بل بوتے پر حل کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عقل، حقیقت کے کلّی ادراک سے عاری ہے۔ لیکن اگر اسے وحی کی روشنی میں استعمال کیا جائے تو یہ حیاتِ انسانی کے لئے دبیز شادابی بن سکتی ہے۔ وحی کی روشنی میں عقل کی حدود بہت زیادہ وسیع ہو جاتی ہیں اور وہ ظن و تخمین کی تاریک وادی میں بھٹکنے کی بجائے اس قابل ہو جاتی ہے کہ علم و یقین کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔ وحی انسانی زندگی اور اس کے نصب العین کے حصول کے لئے راہنما اصول متعین کرتی ہے اور پھر عقل کو ان کی روشنی میں تفصیلات و جزئیات وغیرہ مرتب کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

عقیدۂ توحید بحیثیت نقطۂ ماسکہ

قرآنی نظام حکمت کی دوسری اہم خصوصیت، وحدانیت کا عقیدہ ہے۔ قرآن کریم نے عقیدۂ توحید کو تمام تر تعلیمات کے نقطۂ ماسکہ اور مرکز و محور کے طور پر پیش کیا ہے اور اسے مطالعۂ کائنات کی ایک بنیادی

---

[1] پروفیسر (ALFRED COBBAN) اپنی کتاب THE CRISIS OF CIVILIZA-TION) میں لکھتے ہیں کہ "عہد حاضر کا سب سے بڑا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ اب چاروں طرف سے عقل اور عقل پرستی پر حملے ہونے شروع ہو گئے ہیں۔" (ص ۸۸)

ضرورت قرار دیا ہے۔ مطالعہ کائنات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان، کائناتی مشملات کی کثرت میں موجود فطری وحدت کا وجدان حاصل کرے اور اس وجدان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کائناتی نظم کے ایک مرکزی اصول اور قوتِ محرکہ کی نشان دہی کرے۔ فطری وحدت کے صحیح وجدانی احساس و یقین کی اسی نشان دہی کا دوسرا نام واحدیتِ خالق کا عقیدہ ہے۔ اس عقیدے تک رسائی حاصل کئے بغیر، مطالعہٗ کائنات کی جو بھی کوشش کی جائے گی وہ بے سود اور لاحاصل ہوگی۔ قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ کائناتی وحدت کا اصل الاصول اللہ تعالیٰ کا وجود ہے جو ایک ہے اور لاشریک ہے۔ اس پر ایمان لانا، کائناتی ارتقاء اور تاریخ انسانی کا ایک لازمی مرحلہ ہے جس کے بغیر یہ دونوں مکمل نہیں ہو سکتے۔ تمام تر مشرکانہ نظریات اور رسم و رواج اپنی اصل کے اعتبار سے جہالت، ضعیف الاعتقادی اور غلط فکر کا نتیجہ ہیں۔ قرآن کریم نے واحدیتِ خالق کے عقیدہ پر جابجا زور دیا ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ کسی بھی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کائناتی مظاہر میں سے کسی کو شریک سمجھتے ہیں، خواہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہوں یا اس سے بالکلیہ منکر ہوں وہ مشرک ہیں اور ان کے لئے کوئی فوز و فلاح نہیں۔ قرآن نے عقیدۂ توحید پر ایمان اور اس کی مؤثر نشر و اشاعت کو مسلمانوں کا فطری مقصدِ زندگی اور ملی نصب العین قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی نشو و نما اور ترقی کا انحصار، اسی نصب العین کی نشو و نما اور ترقی پر ہے۔ بالفاظ دیگر عقیدۂ توحید کی مؤثر نشر و اشاعت، مسلمانوں کی ایک حیاتیاتی ضرورت ہے۔ ان کے وجود کا انحصار اسی پر ہے۔ اگر یہ اس سے اغماض برتیں گے یا اس فرض سے صحیح طور پر عہدہ برآ نہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے قانونِ استبدالِ اقوام کے تحت انہیں ختم کر دے گا اور ایسے لوگوں کو آگے لائے گا جو کائناتی ارتقاء کے اس ناگزیر تقاضے کو پورا کریں گے۔ قرآنی نظامِ حکمت کی رو سے کائناتی ارتقاء کا مقصد ہے انسانی زندگی کی فوز و فلاح، اور اس فوز و فلاح کا حصول عقیدۂ توحید پر سچے ایمان اور اس کی مؤثر نشر و اشاعت ہی کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ مطالعۂ کائنات کے تمام تر مباحث و مسائل اور انسانی علوم کے تمام تر شعبوں کو عقیدۂ توحید سے متعلق کریں اور انہیں عقیدۂ توحید کے منہاج پر مدوّن کریں۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے ہمیں اسلامی سائنس اور اس کے صحیح کردار و خصوصیات کو متعین کرنے میں راہنمائی مل سکتی ہے۔

متعین مقصد اور نصب العین

کائناتی ارتقاء پر اگر مقصد اور نصب العین کے پہلو کو نظر انداز کر کے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل ایک طویل مدت سے یونہی بلا کسی مقصد کے جاری ہے۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ کائناتی ارتقاء کا فطری تقاضا ایک متعین مقصد اور نصب العین میں مضمر ہے۔ نیز یہ کہ جس طرح ارتقاء عمل تخلیق کے لوازمات میں سے ایک ہے اسی طرح نصب العین کا تعین اور اس کے حصول کی جد و جہد ارتقاء کے لوازمات میں سے ایک ہے اور یہ تینوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

عمومیّت

قرآنی نظامِ حکمت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مطالعۂ کائنات کسی خاص فرد یا جماعت سے مخصوص نہیں ہے۔ قرآن کریم کے مطابق مظاہر فطرت میں غور و فکر کرنا ہر انسان کے فرائض میں شامل ہے۔ لہذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا تعلق فلاں قسم کے افراد سے ہے اور فلاں قسم کے افراد سے نہیں ہے۔ قرآنی نظامِ حکمت کی عمومیت ہی کے فیوض و برکات ہیں جو ہمیں قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں کی شاندار اور پُر وقار علمی و سائنسی ترقی کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

وحدتِ علم اور وحدتِ کائنات

وحدتِ کائنات اور وحدتِ خالقِ کائنات کا مسلّمہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ علم کی وحدت پر یقین کیا جائے۔ وحدتِ علم سے مراد یہ ہے کہ تمام علوم کا ماخذ و منبع ایک ہے اور ان کا مقصود و منتہا یعنی نصب العین بھی ایک ہے۔ علم ایک کائناتی و آفاقی حقیقت ہے جو بجائے خود ایک اکائی ہے۔ انسان نے اپنی سہولت کی غرض سے اسے مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ ورنہ یہ تمام شعبے ایک فلسفیانہ تعلق کی بنا پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ علم ایک وجدانی احساس اور مشاہداتی حقیقت ہے جو سب کے لئے یکساں ہے۔ جس طرح وحدتِ کائنات کا لازمی نتیجہ عقیدۂ توحید پر ایمان ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وحدتِ علم کا مسلّمہ بھی عقیدۂ توحید کی عالمگیریت اور عمومیت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ قرآن کریم، علم کو نفع یا نقصان کے پیمانوں کے مطابق علم نافع اور علم ضار میں تقسیم کرتا ہے لیکن یہ تقسیم بھی علم کی ماہیت پر مبنی نہیں بلکہ اس کا تعلق بھی علم کے اضافی خصائص و وظائف سے ہے اور یہ تقسیم، وحدتِ علم کے مسلّمہ کی نقیض نہیں ہے۔

تدوینِ علومِ انسانی کا مخصوص انداز

قرآنی نظامِ حکمت کے مندرجہ بالا خصائص کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی رُو سے علومِ انسانی

کی تدوین اس انداز سے کی جانی چاہیئے کہ وہ ان خصائص سے ہم آہنگ ہو۔ یہ خصائص انسانی علوم کی تدوین کے لئے جن راہنما اصولوں کی نشاندہی کرتے ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ حقیقتِ کائنات، وحدتِ کائنات اور وحدتِ علم کے بنیادی تصورات کو انسانی علوم میں سمو دیا جائے۔ یہ تین تصورات اپنے اندر ایسی قوت رکھتے ہیں کہ انسانی علوم کی غرض و غایت اور متن کی تفصیلات وغیرہ کو اپنے رخ پر موڑ سکتے ہیں۔

انسانی فطرت کے مطالعہ کی اہمیت

قرآن پاک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالعۂ کائنات کا سب سے اہم موضوع خود انسان، انسانی ذات اور اس کی فطرت کا مطالعہ ہے۔ اگر ہم انسانی علوم کی تدوین و ترتیب میں درجِ بالا راہنما اصول کو مدِّنظر رکھیں تو یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ انسان اور انسانی فطرت کا مطالعہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ قرآن کریم نے انسان کی توجہ کائنات کے مختلف شعبوں مثلاً طبعیات، حیاتیات، فلکیات اور حیوانیات وغیرہ میں غور و فکر کرنے کی طرف مبذول کرائی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ زور انسان اور اس کی ذات کے مطالعہ پر دیا ہے۔ قرآن کریم نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ انسان کی تخلیق کا مقصود مدعا کیا ہے؟ اس کائنات میں انسان کو کیا مقام حاصل ہے؟ انسانی اعمال و افعال کے محرکات کیا ہیں اور یہ اپنی اصل کے اعتبار سے مادّی ہیں یا غیر مادّی؟ انسانی علم و تحقیق کا یہی گوشہ ہے جس پر فکرِ مغرب نے سب سے کم توجہ دی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کائنات، اس کی تخلیق اور انسانی زندگی کی خالصتاً مادّی تعبیر اور بے خدا سائنسی فکر نے مادی سائنس کو بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن انسان اور انسانی ذات کے خصائص پر سے آج تک پردہ نہیں اٹھایا جاسکا۔ آج مغرب کے مفکرین انگشت بدنداں ہیں کہ ان کی وسیع علمی و تحقیقی معلومات نے اس اہم ترین موضوع پر روشنی نہیں ڈالی سائنسدانوں نے جدید ترین تکنیکی و فنی سہولتوں سے آراستہ تجربہ گاہوں میں انسان کا سائنسی مطالعہ کرنے پر سالہاسال صرف کیے۔ انسانی جسم کے ایک ایک عضو اور حصہ پر تحقیق کی گئی حتیٰ کہ مرد و عورت کے جنسی اختلاط کے بغیر بچے کی پیدائش کا کامیاب تجربہ بھی کر دکھایا گیا۔ اس ضمن میں نیویارک کے راک فیلر انسٹی ٹیوٹ کا ذکر بطورِ خاص کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان تمام تر سائنسی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی ذات کا کردار، اس کی خصوصیات، اور فطری حقیقت اور اعمال و افعال کے محرکات نامعلوم ہی رہے۔ حقیقت یہ ہے

کہ جب تک ان تحقیقات کی بنیاد قرآنی منہاج اور قرآنی نظامِ حکمت کے بنیادی تصوّرات پر نہ رکھی جائیگی اس وقت تک یہ عقدہ لاینحل رہے گا۔ چونکہ مغربی تحقیقات کا منہاج غیر قرآنی ہے اس لئے مفکرینِ مغرب میں سے میکڈوگل، ایڈلر، فرائڈ اور ان کے پیروکاروں نے ان سوالات کا جواب انسانی جبلتوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، جو حد درجہ لغو اور شرفِ انسانیت کے لئے انتہائی باعثِ شرم ہے۔ مطالعۂ کائنات کا کوئی نظامِ حکمت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک وہ فطرتِ انسانی اور اس کے صحیح کردار کا تعین نہ کرے اور انسانی اعمال و افعال کے محرکات کا سراغ نہ لگائے۔ آیئے ہم قرآن کریم کی روشنی میں ان بنیادی سوالات کا جواب تلاش کریں۔ قرآن پاک بیان کرتا ہے کہ انسانی فطرت، حقیقتِ کائنات کی جستجو سے عبارت ہے۔ اور خالقِ کائنات کی اطاعت، انسانی فطرت کا سب سے بڑا عنوان ہے۔ سورۂ روم میں کہا گیا ہے:۔

فاقِم وجھك لِلدّین حنیفاً فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لاتبدیل لخلق اللہ ذالك الدّین القیّم ہ

اللہ کے دین پر مستقل مزاجی سے قائم رہو۔ یہ وہی فطرتِ انسانی ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ پیدائشی تقاضے بدلا نہیں کرتے۔ یہی مضبوط راستہ ہے۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرت انسانی کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:۔

کُلّ مولود یولد علیٰ فطرۃ الاسلام فابواہ یھودانہٖ او ینصّرانہٖ او یمجّسانہٖ۔

یعنی ہر بچہ خالقِ کائنات کی اطاعت کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کے تمام تر اعمال و افعال اسی جذبۂ محرکہ سے تحریک حاصل کرکے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یعنی نفسِ انسانی کے اندر بنیادی طور پر یہ چیز ودیعت کردی گئی ہے کہ وہ حقیقتِ کائنات کا شعور حاصل کرے۔ اس کے خالق سے محبّت کرے اور اس کی اطاعت اختیار کرے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی فطرت کا یہ بنیادی تقاضا کبھی بدل نہیں سکتا۔ یہ کہیں غائب یا گم نہیں ہوسکتا۔ ایسا تو

---

[۱] القرآن الکریم، الرّوم، ۳۰

ہوسکتا ہے کہ انسان اس کا غلط استعمال کرے اور اسے غلط رُخ پر ڈال دے۔ لیکن یہ سرے سے مفقود نہیں ہوسکتا۔ کافر اور مومن دونوں کی فطرت کا یہی تقاضا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کافر اپنی فطرت کے اس تقاضا کو غلط رُخ پر ڈال دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

ومن النّاس من یتّخذ من دون اللّٰہ انداداً یحبّونھم کحبّ اللّٰہ والّذین آمنوا اشدّ حبّاً للّٰہ ٥

کچھ لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے تصوّرات یا شخصیات کو اپنا معبود بنالیتے ہیں اور ان سے ایسی محبّت کرتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن ایسے لوگ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے دل اللہ کی ایسی محبّت سے معمور ہوتے ہیں جو تمام محبّتوں پر غالب ہوتی ہے۔[۸]

بالفاظِ دیگر بعض لوگ اپنی فطرت کے تقاضوں کو اپنی ہوا و ہوس یا بعض شخصیات (زندہ یا مُردہ) یا بعض نظریات کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ یہ غلط رُخ ان کی غلط سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں معقولیت نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں ایک مقام پر کہا گیا ہے :-

ءَ اربابٌ متفرّقون خیرٌ ام اللّٰہ الواحدُ القھّار، ما تعبدون من دونہٖ الاّ اسمآءً سمّیتموھا انتم وآباءُکُم۔۔۔ ٥

بہت سے ربّ قرار دے لینا اچھا ہے یا ایک ہی غالب ربّ پر ایمان لانا بہتر ہے؟ تم خالقِ حقیقی کو چھوڑ کر چند ایسے ناموں کی عبادت کر رہے ہو جو تم نے اور تمہارے آباؤاجداد نے از خود وضع کر لئے ہیں[۹]

قرآن کریم نے تبلیغی مقاصد کے مدِّنظر انبیائے سابقین اور مللِ گزشتہ کی نظریاتی تاریخ کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس ضمن میں جابجا جھوٹے خداؤں اور شرک کی مختلف صورتوں کا ذکر بھی کیا ہے عصرِ قدیم کا شرک آج عصرِ جدید کے ترقی یافتہ شرک کی صورت اختیار کر چکا ہے یعنی قدیم بت پرستی اور قبر پرستی نے آج کی جدید اصطلاح میں ازموں (ISMS) کی صورت اختیار کر لی ہے۔

---

۸ القرآن الکریم ، البقرہ : ۱۶۵

۹ ایضاً :- یوسف : ۳۹ - ۴۰

قرآن کریم کی مندرجہ بالا تعلیمات کی روشنی میں ہم اس کائنات میں انسان کے مقام کا تعین کرسکتے ہیں اوپر کہا جا چکا ہے کہ کائناتی تخلیق کا مقصود بالذات، انسان اور انسانی زندگی کی فوز و فلاح ہے۔ انفس کے ساتھ آفاق (OUTER WORLD) کی تخلیق انسانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ اس کائنات میں انسان ایک بلند تر مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے قرآن میں خلافت یا نیابت خداوندی قرار دیا گیا ہے۔ انسان، کائناتی ارتقاء کی ایک کڑی ہے اور انسان کا نفسیاتی اور روحانی ارتقاء اس کڑی کا نقطۂ عروج ہے۔ جو حقیقتِ کائنات کے ایک شعوری وجدان سے عبارت ہے۔ لیکن اس فضیلت کے باوجود انسان اپنے لئے ضابطۂ حیات خود نہیں بنا سکتا۔ اس کی زندگی کیسی ہو؟ اس کے معاملات کیسے ہوں، اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تقاضے کیا ہوں؟ انہیں کیونکر پورا کیا جائے؟ ان تمام سوالات کا تعلق ضابطۂ حیات سے ہے جس کی تدوین و تشکیل خالقِ کائنات نے اپنے ذمہ لی ہے۔ تاکہ انسان اپنی خواہشات اور جہالت کے باعث صحیح راستے سے ہٹ کر غلط راستہ پر نہ چل نکلے اور مقصد حیات کے حصول میں ناکام رہے۔ قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

ثم جعلناک علی شریعۃٍ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون۔

اے پیغمبر، پھر ہم نے آپ کو دین کے معاملہ میں ایک شریعت پر قائم کیا ہے۔ لہذا تم اسی کی پیروی کرو اور بے علم لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔[۱۰]

ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ:۔

وعسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون۔

ہو سکتا ہے کہ تمہیں جو ناپسند ہو وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور جو تمہیں پسند ہو وہی تمہارے لئے نقصان دہ ہو۔ اللہ ان رموز سے واقف ہے تم واقف نہیں ہو۔[۱۱]

لہذا اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے تمہیں ہدایت کا راستہ بتایا ہے۔ اور اس راستہ پر چلنا تمہارے

---

[۱۰] القرآن الکریم، جاثیہ - ۱۸

[۱۱] ایضاً، البقرہ - ۲۱۶

لئے ضروری قرار دیا ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکٰفرون۔

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے دین سے ہٹ کر فیصلے کریں وہی منکر اور کافر ہیں۔

قرآن نے شریعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اس راستہ پر چلنے کی دعوت کا تعلق کسی قسم کے جبر سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق قانون مکافات عمل سے ہے۔ یعنی انسان کو اس امر کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ غلط اور صحیح میں سے جسے چاہے اختیار کر لے۔ ہر ایک عمل کا نتیجہ وقتِ مقررہ پر اس کے سامنے آکر رہے گا۔

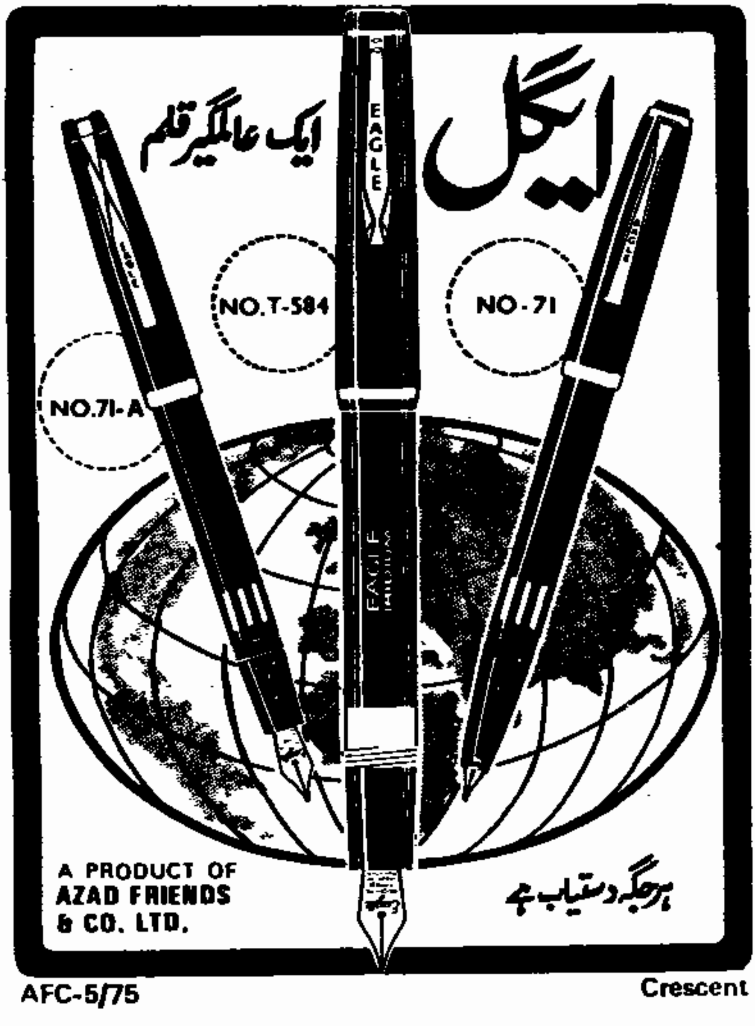

AFC-5/75 Crescent